ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دَورۂ تُرکی کے مشاہدات

جناب خلیل حامدی صاحب

(۷)

آبنائے باسفورس | دل استنبول میں ہے اور رُخ انقرہ کی جانب۔ باسفورس کے کنارے پر جاکر ہماری بس رُک گئی۔ چند لمحات کے بعد ہماری بس یورپ سے نکل کر ایشیا میں رینگنے لگے گی۔ صرف آبنائے باسفورس درمیان میں حائل ہے۔ ہمارے پیچھے سات پہاڑیوں کا شہر ہے۔ یورپی استنبول۔ اُس کی سُرخ کھپریل کی چھتیں اور چوبی مکان بڑے دلکش ہیں۔ سات سو مسجدوں کا یہ شہر اپنی رنگین و خوشنما روشنیوں کے ساتھ باسفورس کے سبز اور نیلے پانی میں پُوری شانِ رعنائی کے ساتھ جھلک رہا ہے۔ بس سے باہر جھانک کر دیکھا تو معلوم ہُوا کہ بسوں، ٹرکوں اور موٹروں کا طویل سلسلہ باسفورس عبور کرنے کے انتظار میں ہے۔ اسٹیمروں اور چھوٹے چھوٹے جہازوں کی کثیر تعداد نقل و حمل کی خدمت انجام دے رہی ہے۔ ہمارے ڈرائیور نے بس لائن میں کھڑی کر دی اور خود ٹکٹ خریدنے کے لیے نیچے اُتر گیا۔ دو تین منٹ کے بعد وہ باسفورس عبور کرنے کا ٹکٹ خرید لایا۔ "شیش کباب" "ضلمہ" — "امام بایلدی" — "دونر کباب" — "دوگون شوربا سی" چاروں طرف سے خوانچے والوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں بک رہی ہیں۔ بس کے مسافروں نے زادِ سفر خریدنا شروع کر دیا۔ سوچا اب یہ رات بھر کا سفر مُترجم کے بغیر کٹے گا۔ کچھ پریشانی سی پیدا ہوئی۔ مجھے بھی سحری کے لیے کھانے پینے کا انتظام کر لینا چاہیے۔ مگر زبان کے باوجود بے زبانی میں گرفتار ہوں۔ لیجیے بے زبانی ہی میرے لیے زبان بن گئی۔ میرے قلق کو ایک نوجوان نے بھانپ لیا۔ پوچھنے لگا: "انگریزی یا عربی جانتے ہیں؟" میں نے کہا ہاں، عربی جانتا ہوں۔ "میرا نام عبدالقادر ہے۔ مصر کا باشندہ ہوں، بیروت میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ہوں۔ فرم کے سلسلے میں کئی بار ترکی آچکا ہوں،

ٹوٹی پھوٹی ترکی بول لیتا ہوں‘‘۔ اس نوجوان نے موانست پیدا کرنے کے لیے ایک ہی سانس میں اپنا بھرپور تعارف کرا دیا۔ میں خوشی کے مارے جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا۔ اس نوجوان نے اپنے لیے بھی کھانے کا سامان خرید لیا اور میری مدد بھی کی۔

استنبول کی عظمت کا نشان باسفورس کے جس منظر سے اب نگاہیں کھیل رہی ہیں اس نے دریائے نیل کے مسحور کن مناظر کو بھی مات کر دیا ہے۔ باسفورس استنبول کی عظمت کا نشان ہے۔ باسفورس کے بغیر یہ شہر بے حقیقت ہوتا۔ اس کی رونق اور چہل پہل رات دن جاری رہتی ہے۔ ترک بچے اس میں بڑی چابکدستی کے ساتھ غوطہ زنی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ لکڑی کی چھڑیں لے کر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ کنارے پر جگہ جگہ قہوہ خانے بنے ہوئے ہیں۔ درختوں کے جھنڈ چھتری تانے کھڑے ہیں۔ بوڑھے لوگ بیٹھے نارجیلہ (حقہ) پی رہے ہیں۔ مستورات اپنے چمکیلے چوبی مکانوں کی بالکنیوں میں بیٹھی ہوئی اس رونق اور چہل پہل کی بہار دیکھ رہی ہیں۔ سفید رنگ کی کشتیاں ایک دوسری کے پاس سے گزرتی ہیں تو اپنے پیچھے ہلکی ہلکی پھوار چھوڑ جاتی ہیں۔ سطح بحر سے کسی قدر اوپر عجیب و غریب پرندوں کے جھنڈ اُڑ رہے ہیں اور کبھی کبھی اُن کے حلق سے ایسی آواز نکلتی ہے، جیسے وہ کسی گم شدہ روح کی تلاش میں ہوں۔ جہازوں کی نقل و حرکت اس قدر منظم اور متواتر ہے کہ ایشیا یورپ میں اور یورپ ایشیا میں چند لمحات میں منتقل ہو جاتا ہے۔

یورپ اور ایشیا کا درمیانی پل ایک اور بات جو غیر ملکی کو متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بسوں اور موٹروں کی اتنی طویل قطاروں کے باوجود ڈرائیوروں کے اندر بے چینی نہیں۔ ترکی بسوں اور ڈرائیوروں کو ہم نے حج کے موقع پر دیکھا ہے۔ یہ لوگ بڑے نظم پسند اور متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ ہنگامہ آرائی، دھکم پیل اور لڑائی جھگڑے سے اکثر و بیشتر اجتناب کرتے ہیں۔ حج کی روحانی فضا میں ہی اُن کا یہ تحمل نہیں دیکھا بلکہ باسفورس کے خالص دنیادارانہ ماحول میں بھی وہ اسی تحمل و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یکایک وسل بجا اور بسیں اور موٹریں حرکت میں آگئیں۔ جہاز کی نچلی سطح پر بسیں اور موٹریں مع سامان اور سواریوں کے سوار ہو گئیں اور اوپر کی کھلی سطح پر پیدل چلنے والے سوار ہو گئے۔ ۱۵ منٹ کے بعد ہم باسفورس کے ایشیائی کنارے پر پہنچ گئے۔ گویا ہم نے جہاز سے آبنائے کو عبور نہیں کیا بلکہ کسی پل پر گزرے ہیں۔ یہ وہ عجوبہ منظر ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں

۱۴۵۳ء میں کشتیوں کے ذریعہ اس باسفورس کو عبور کر کے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا تو اس منظر کی کشش میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ بدن میں ایسی زندگی بخش جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے کہ سخت سردی کے باوجود پسینہ چھوٹنے لگتا ہے۔ ایشیائی استنبول اور یورپی استنبول کہنے کو دو الگ الگ براعظموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر عملاً فرق کیا ہے؟ یورپی استنبول کی طرح یہاں بھی مرد سوٹوں میں ہیں، عورتوں کی نصف سے زیادہ رانیں عریاں ہیں۔ زبانِ گفتگو وہی۔ درمیانہ قامت، متین چہرہ، خندہ پیشانی، دھیمی رفتار، کم گوئی اور محنت کشی جو یورپ کے ترکوں میں ہے وہی ایشیا کے ترکوں میں بھی ہے۔ مسجدوں کے میناروں پر رمضان کی خوشی میں جو قمقمے "فاتح" میں ہالہ تن رہے تھے ویسے ہی قمقمے "قاضی کوئی" میں بہار دکھا رہے ہیں۔ بے فکرے (ہپیز) لوگوں کے ریوڑ دونوں حصوں میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ بہمہ نوع یکسانیت کے باوجود ذہن یہ محسوس کر رہا تھا اور بلا دلیل محسوس کر رہا تھا کہ یورپ یورپ ہے اور ایشیا، ایشیا۔

۲۵ لاکھ کی آبادی کے شہر سے بس کا بسلامت نکل جانا اور کسی جگہ بھی بس کے ڈرائیور کا کسی دوسری بس کے ڈرائیور سے تو تکار نہ ہونا نیک شگون ہے۔ استنبول کی پسماندہ اور ناہموار گلیوں سے بھی بس گزری اور بڑی شاہراہوں سے بھی۔ دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی بجلی کی روشنی کے اشتہارات کا رواج ہے۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ بنکوں کے ناظمِ اشتہارات بڑے چوکس ہیں۔ ہر جگہ بنکوں کے اشتہارات نظر آتے ہیں، جو راہ گیروں کو یاد دلا رہے ہیں کہ ہمارے سُود کی شرحیں بہت عمدہ اور ہماری مالی ساکھ نہایت مستحکم ہے۔ یہاں بھی راتوں کو قہوہ خانوں میں بیٹھ کر قہوہ پینا، نارجیلہ کے کش لگانا اور نَرد کھیلنا محبوب مشغلہ ہے۔ رات کا ابتدائی حصہ گزر چکا ہے۔ عام دکانیں بند ہو رہی ہیں مگر قہوہ خانوں کی آبادی عروج پر ہے۔

ایک مصری نوجوان کی رفاقت بس کی سیٹیں ہوائی جہاز کی طرز پر بنائی گئی ہیں۔ ائیرکنڈیشنر نے بس کو اندر سے خوب گرم کر رکھا ہے۔ مصری نوجوان عبدالقادر نے میری طرف پینترا بدلتے ہوئے ایک طویل گفتگو کی داغ بیل ڈال دی۔ مجھ سے پوچھا کہ پاکستان کا کیا حال ہے؟ میں نے بولنے کی ڈیوٹی عبدالقادر کی طرف منتقل کرتے ہوئے مصر کے داخلی حالات پر متعدد سوال کر دیئے۔ مجھے اندازہ تھا کہ کسی مصری کو اگر اطمینان ہو جائے کہ اُس کا مخاطب جاسوس نہیں ہے تو وہ پھٹ پڑتا ہے اور مصر کے پوست کندہ حالات سے نقاب اٹھا دینے پر

تامل نہیں کرتا۔ عبدالقادر سے بھی مجھے یہی توقع تھی۔ صرف ایک بات کا خدشہ تھا۔ عبدالقادر لبنان میں رہتا ہے، اور لبنان کے مسلمانوں پر مصر کے حکمران جمال عبدالناصر کا بڑا جادو چلتا ہے۔ بلکہ صرف لبنان کے مسلمان اور فلسطین کے باشندے ہی دو ایسے گروہ ہیں جو جمال عبدالناصر پر فریفتہ ہیں۔ اس فریفتگی کی اصل وجہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ بیروت میں ایک مرتبہ راقم الحروف ایک حجام کی دکان پر بیٹھا تھا۔ جمال عبدالناصر کی "مقدس" شخصیت زیرِ بحث تھی۔ حجام نے دورانِ گفتگو انکشاف کیا کہ "جمال عبدالناصر نے قرآن کریم کی ایک ایسی تفسیر لکھی ہے کہ آج تک کسی عالم نے ایسی تفسیر نہیں لکھی ہوگی"۔ اس گفتگو میں مَیں نے بھی دخل دینا چاہا مگر لبنان کے دوستوں کی یہ بات مجھے یاد آگئی کہ "لبنان میں جمال عبدالناصر کی مخالفت بڑی مہنگی پڑتی ہے"۔ عبدالقادر صاحب میرے خدشات کے برعکس نکلے۔ ۳۰ برس کا نوجوان، اقتصادیات کا ایم۔ اے۔ اُس کا چہرہ لال پیلا ہوگیا اور خالص مصری لہجے کے اندر مصر کے حالات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ بتانے لگا کہ قاہرہ میں ہمارا مکان حکومت نے ضبط کر لیا۔ میرے بوڑھے والدین کو زدوکوب کیا گیا۔ نقدی اور زیورات تک چھین لیے گئے۔ میرے دوسرے رشتہ داروں اور جان پہچان والے لوگوں کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ اب مصر کی اقتصادی حالت برباد ہو چکی ہے۔ ہمارے کئی رشتہ داروں کی خواہش ہے کہ وہ مصر سے نکل آئیں اور لبنان یا کسی اور مقام پر پناہ لے لیں مگر ایسی شدید ناکہ بندی ہے کہ کسی مصری کا مصر سے باہر نکلنا آسان نہیں ہے۔ جاسوسی کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہر وقت خوف و ہراس کی فضا طاری رہتی ہے۔ ہماری جائداد بلا دلیل و حجت ضبط کر لی گئی۔ ہمیں بے بس کر دیا گیا۔ کہیں واویلا بھی نہیں کر سکتے۔ عبدالقادر کو اپنی جائداد کی ضبطی کا شدید غم تھا۔ وہ یہ بات کرتے وقت شدید غیظ میں ڈوب رہا تھا۔ مَیں نے اُس سے اخوان المسلمون کے بارے میں دریافت کیا۔ اخوان کے بارے میں اُسے تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔ اخوان پر ظلم و ستم کے واقعات کی اُس نے تصدیق کی اور کہا کہ یہ بھلے لوگ ہیں، اور ہر بھلا شخص مصر میں گردن زدنی ہے۔ مصر کے قرضوں، جنگ میں مصری فوجوں کی شکست اور مصری حکام کی منافقت پر لگاتار اُس کی گفتگو جاری رہی۔ دو گھنٹے تک متواتر عبدالقادر صاحب دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ مَیں درمیان میں مصریوں کے انداز میں بار بار "یاسلام" کے لفظ سے عبدالقادر کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا رہا کہ مَیں اُس کی گفتگو بڑے انہماک سے

سُن رہا ہوں۔ گو مجھے نیند آ رہی تھی اور کبھی باہر کی دنیا کی طرف بھی دھیان اُٹھ جاتا تھا مگر مصر کے اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی حقیقت یہ ہے کہ عبدالقادر نے مصر کے اندرونی حالات کی جو تصویر بیان کی وہ بڑی تکلیف دہ اور افسوسناک تھی۔ یہ حالات ہمیں لگا ہے ناگہ ہے معلوم ہوتے رہتے ہیں مگر ایک مصری جب اپنی زبان سے اپنی داستانِ غم بیان کرتا ہے تو دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ عبدالقادر اس قدر بھرا ہوا تھا کہ دو گھنٹے کی مسلسل گفتگو سے بھی اُسکی طبیعت سیر نہ ہوئی آخر میں مجھ سے کہنے لگا کہ ایک انسان کی فطرتی خواہش ہوتی ہے کہ اُسے کوئی ایسا ہمدم ملے جس کے سامنے وہ اپنا دکھ درد بیان کر کے اپنی طبیعت کو ہلکا کر لے میں لبنان کے اندر بھی دل کی بات کھل کر نہیں کر سکتا چونکہ آپ پاکستانی ہیں اس لیے مجھے یہ کچھ کہنے کی ہمت ہو گئی"۔ استنبول سے انقرہ ۴۴۶ کیلومیٹر ہے یعنی تقریباً پونے تین سو میل ایشیائی ترکی یعنی اناضول (جسے ترک "اناد ولو" کہتے ہیں) کی سطح مرتفع پر ساری رات بس گزرتی رہی۔ راستے میں کہیں کہیں بس پٹرول لینے کے لیے رک جاتی تھی بس کے لیے جو رفتار مقرر کی گئی ہے اُسی رفتار پر چلتی رہی۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کا جو جنون پاکستان اور سعودی عرب میں پایا جاتا ہے اُسے ترکی میں اُبھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اس معاملے میں پولیس کا محاسبہ بڑا سخت اور بے لوث ہوتا ہے بس کے مسافروں میں غیر ملکی زیادہ نظر آتے تھے اور ترک کم۔ عبدالقادر نے بھی روزہ رکھا اور راقم الحروف نے بھی بس کے پچھلے حصے میں بعض عورتیں بھی سحری کھا پی رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی روزہ رکھا ہو۔

انقرہ میں بس دیر سے پہنچی۔ روشنی خوب پھیل چکی تھی۔ استنبول کے دوستوں نے نوری تحریک کے دو ذمہ دار آدمیوں سعید اُزدمیر اور حاجی ابراہیم قیا کو میری آمد کی اطلاع فون سے کر دی تھی۔ حاجی ابراہیم قیا اور اُن کے صاحبزادے علاؤ الدین قیا بس کے اڈے پر آئے مگر بس لیٹ ہو جانے کی وجہ سے مایوس واپس چلے گئے۔ انقرہ کی سردی استنبول سے بھی زیادہ سخت اور پریشان کن ہے استنبول میں بوندا باندی جاری رہنے کی وجہ سے سردی میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے مگر انقرہ میں برف باری کے ساتھ ہوا بھی چل رہی ہے۔ عبدالقادر نے میری مدد کی ٹیکسی میں سامان رکھا اور جامع حاجی بیرم خاں پہنچ گیا۔ مسجد کے باہر کھڑا تھا کہ ایک ضعیف العمر ترک نے اشارے سے دریافت کیا کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں نے ترکی انداز میں کہا: "نور مکتبہ"۔ اُس نے میرا بھاری بھرکم سوٹ کیس اُٹھا لیا۔ اور میرے واویلا کے باوجود بیس تیس قدم کے فاصلے پر واقع مکتبۂ نور میں لے گیا۔

مکتبۂ نور حاجی ابراہیم قیا اسی نوعیت کی عربی بول لیتے ہیں جس طرح ہمارے ہاں کے عربی مدارس کے لوگ۔ بہرحال ایک ترک اور ایک پاکستانی دونوں عربی زبان کو ذریعۂ اظہارِ خیال بنانے کا تجربہ کرتے رہے۔ قیا صاحب "طلبۂ نور" کے صفِ اول کے لوگوں میں سے ہیں۔ سعید اُزدمیر بھی اس جماعت کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ ۲۷ رمضان المبارک کو بدیع الزمان سعید نورسی مرحوم کی سالانہ برسی منائی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں سعید

اور ممبر از ممبر دسمبر تا) گئے ہوئے ہیں۔ آج شام تک واپس آجائیں گے۔ یہ مکتبہ جس میں ہم بیٹھے ہیں اسلامی کتب خانہ ہے۔ ترکی کے اندر اسلام کے موضوع پر جو لٹریچر تیار ہو رہا ہے وہ اس مکتبے میں موجود ہے۔ مولانا مودودی کی تصنیفات، اخوان المسلمون کے رہنماؤں کی کتابیں، اور دیگر اسلامی لٹریچر بڑی تیزی کے ساتھ ترکی زبان میں منتقل ہو رہا ہے۔ عربی تفاسیر، صحاح ستہ اور فقہ کی کتابوں کا ترجمہ بھی رومن ترکی میں ہو رہا ہے۔ صحیح بخاری، ہدایہ، قدوری، بلوغ المرام، ریاض الصالحین، اور تفسیر ابن کثیر کے تراجم مکتبۂ نور میں دیکھے۔ مدارس ائمہ و خطباء اور ہائر اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے کھل جانے سے اسلامی کتابوں کی مانگ عوامی پیمانے پر پیدا ہو گئی ہے۔ اقتصاد، سیاست، اخلاق، قانون، تاریخ اور معاشرتی علوم وغیرہ ہر موضوع پر رومن ترکی میں اسلامی لٹریچر آنا شروع ہو گیا ہے۔ ابراہیم قیا صاحب نے مجھے خاص طور پر عربی سیکھنے کی کتابیں دکھائیں۔ ترک طالب علم اگر عربی زبان سیکھنا چاہے تو اسے گرامر اور انشاد دونوں پہلوؤں پر عبور حاصل کرنے کے لیے ترکی میں کئی سلسلے مل جاتے ہیں۔ میں نے قیا صاحب سے عربی زبان کی مقبولیت کے باب میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ ترک نوجوانوں میں عربی زبان سیکھنے کا شوق جنون کی حد تک پایا جاتا ہے۔ اور لڑکیوں کے اندر لڑکوں سے بھی زیادہ یہ شوق پیدا ہو رہا ہے۔ بگڑے ہوئے طبقے کو چھوڑ کر ہر مسلمان لڑکی کی یہ خواہش ہے کہ وہ قرآن حفظ کرے اور عربی زبان میں گفتگو کرے۔ مکتبۂ نور میں دو گھنٹے گزارے۔ قیا صاحب سے بات چیت ہو رہی تھی کہ تین لڑکیاں آئیں، جنہوں نے سر سے لے کر پاؤں تک مکمل ساتر لباس پہن رکھا تھا، صرف چہرے ننگے تھے۔ قیا صاحب سے متعدد اسلامی کتابیں انہوں نے خریدیں۔ انہیں امام غزالیؒ کی احیاء العلوم درکار تھی مگر قیا صاحب کے پاس یہ کتاب نہ تھی۔ قیا صاحب نے انہیں بتایا کہ احیاء العلوم کا ترکی ترجمہ زیر طبع ہے۔ مکتبۂ نور کی معلومات افزا فضا میں بیٹھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قلب و نظر زمان و مکان کی حد بندیوں کو توڑ چکے ہیں۔ اسلامی تحریک کا ایک عالمگیر کارواں شرق تا غرب محوِ خرام ہے۔ اُس کے ساز گو مختلف ہیں مگر نغمہ ایک ہی ہے۔ رنگ الگ الگ ہیں مگر خوشبو ایک ہی ہے۔ حُدی خوانوں کے لہجوں کی بوقلمونی اور حُدی کی یکسانیت نے اِس کارواں کی وحدت کو کثرت اور کثرت کو وحدت میں سمو دیا ہے۔ مکتبے میں داخل ہونے والا ہر فرد مجھ سے سلام اور معانقہ کرتا اور پھر تعارف حاصل کرتا۔ کسی مہمان کو دیکھ کر لپک کر اُسے سلام کرنا اور جوشِ استقبال

دکھانا عربوں اور ترکوں پر ختم ہے۔ افسوس ہے کہ پاکستان کے اکثر لوگ اِس اچھی عادت سے تہی دامن ہیں۔ میرا اپنا بارہا کا تجربہ ہے کہ ایک عرب مہمان آیا تو ایک آدھ کے سوا دوسرے حضرات نے اُس سے مصافحہ تک نہیں کیا۔ ابھی حال ہی کی بات ہے کہ ایک عرب عالم دین لاہور آئے۔ ہمارے ایک دوست نے انہیں اپنے گھر میں جہاں اُن کا دفتر بھی ہے دعوت دی۔ جب ہم اُن کے گھر داخل ہوئے تو سوائے اُن کی اپنی ذات کے کسی نے اُٹھ کر اُن سے مصافحہ تک نہیں کیا۔ بعد میں عرب عالم دین نے مجھ سے پوچھا کہ کیا جو لوگ یہاں بیٹھے تھے وہ غیر تھے؟ یہ "غیر تہذیب" دانستہ نہیں اختیار کی جاتی بلکہ نادانستہ طور پر ایک عادت بن گئی ہے کسی ترکی گھرانے میں جب آپ جائیں گے تو تمام بڑے لوگ مصافحہ اور معانقہ کرینگے اور چھوٹے بچے ہاتھ کو بوسہ دینگے۔

مدرسۂ یوسفی حاجی ابراہیم قیا بڑے کامیاب طریقے سے اپنا مکتبہ چلا رہے ہیں۔ ان کا مکتبہ "طلبۂ نور" کا مرکز بھی ہے اور نشر و اشاعت کا ادارہ بھی۔ مگر اس کاروبار کا دوسرا پہلو بھی ہے۔ حاجی ابراہیم قیا صاحب آج سے صرف چار روز پہلے جیل سے رہا ہو کر آئے ہیں۔ مَیں نے حیرت میں ڈوب کر اُن سے پوچھا کہ کس جُرم میں آپ جیل میں ڈال دیئے گئے تھے؟ میرا یہ سوال مواساۃ کے جذبے کے تحت تھا۔ ابراہیم قیا صاحب مُسکرا کر بولے "مدرسہ یوسفیہ کی سند حاصل کرنے کا شوق جیل میں لے گیا تھا" نوری تحریک کے لوگ جیل کو "مدرسہ یوسف" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس مدرسہ میں داخل ہونا ان کے نزدیک پریشانی کا باعث نہیں ہے بلکہ فخر و اعزاز کا مقام ہے۔ وہ اس مدرسہ میں مسکراتے ہوئے جاتے ہیں اور مسکراتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ حاجی ابراہیم قیا صاحب جن کی عمر ۵۰ سال سے کم نہ ہوگی، بدیع الزماں نورسی مرحوم کی تصنیفات جنہیں "رسائلِ نور" کہا جاتا ہے تقسیم کرنے کے جُرم میں گرفتار کر لیے گئے۔ رسائلِ نور کی اشاعت و تقسیم جُرم ہے یہ رسائلِ نور بدیع الزماں نورسی مرحوم کی تقریروں، خطبوں اور درسوں پر مشتمل ہیں۔ ۱۹۵۰ء سے پہلے تک ان رسائل کی طباعت جُرم تھی۔ طلبۂ نور راتوں کو بیٹھ کر ہاتھوں سے لکھتے تھے اور ہاتھوں ہاتھ پھیلاتے تھے۔ عدنان مندریس مرحوم کے دورِ وزارت میں ان کی طباعت پر سے پابندی اٹھالی گئی جس کے نتیجے میں ان کی بکثرت اشاعت ہوئی۔ اب پھر ان کی کھلم کھلا اشاعت ممنوع ہے۔ حکومت اگر آزادئ فکر کے اصول کے تحت ان سے چشم پوشی بھی کر لیتی ہے تو ترکی کا سوشلسٹ، لادین اور ملحد عنصر رواداری سے کام نہیں لیتا۔

سیکولر دستور کا سہارا لے کر ان کے خلاف عدالتوں میں مقدمے دائر کر دیتا ہے اور رسائل تقسیم کرنے والوں اور چھاپنے والوں کو مختلف سزائیں دلواتا ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ ہر شخص کے گھر میں یہ رسائل موجود ہیں اور ان کا اجتماعی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم نے اِن رسائل میں جو دعوت بیان کی ہے اُس کا خلاصہ ہے اسلامی معاشرے کا احیاء، اسلامی قوانین کا نفاذ، اسلامی خلافت کی بحالی اور اتحادِ اسلامی کا قیام۔ اسی دعوت کو ترکی کے ملاحدہ "بغاوت" سے تعبیر کرتے ہیں۔

برلن ہوٹل میں قیام مکتبۂ نُور سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر برلن ہوٹل میں مجھے ٹھہرا دیا گیا۔ اچھا صاف ستھرا ہوٹل ہے۔ اس کا مالک بھی کوئی مسلمان ہے۔ راستے میں بازار ہے۔ اُونچی دکانیں بھی موجود ہیں اور پھیری والے بھی سڑک کے دونوں طرف چھوٹا چھوٹا سامان لگائے کھڑے ہیں۔ البتہ آوازیں لگانے کا وہ ہنگامہ یہاں برپا نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ کچھ لڑکے ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے رومال لیے پھرتے ہیں جنہیں عورتیں مسجد میں جانے وقت سر پر باندھ لیتی ہیں۔ یہاں امارت و غربت کا امتیاز استنبول کی نسبت زیادہ نمایاں ہو گیا ہے۔ اسلام اور الحاد کا مقابلہ بھی یہاں زیادہ تازہ دم اور تیز و تند ہے۔ آج ۲۷ رمضان المبارک ہے۔ اس لیے ریڈیو نے بھی اپنے گانوں اور دھنوں کا چولا بدل لیا ہے۔ رات بھر ریڈیو سے قرآن کریم کی تلاوت اور نعت خوانی ہوتی رہی اور دن کے پروگرام بھی ملے جُلے نغمیہ کورسوں تک محدود رہے۔ یہاں ریڈیو سرکاری ادارہ نہیں ہے بلکہ پبلک ادارہ ہے اور تجارتی بنیادوں پر قائم ہے۔ رات بھر سفر کی تھکاوٹ اور روزے کے ضعف کی وجہ سے ظہر تک ہوٹل میں آرام کیا۔

انقرہ کی مشہور ترین مسجد ظہر کی نماز جامع حاجی بیرم خاں میں ادا کی۔ مکتبۂ نور سے چند قدم دُور یہ انقرہ کی قدیم ترین اور مشہور ترین مسجد ہے۔ حاجی بیرم خاں اس دیار کے مشہور و معروف ولی تھے۔ سنہ ۱۴۲۷ء میں اپنی وفات سے دو سال قبل انہوں نے اِس مسجد کی تعمیر کروائی اور بیرمی سلسلہ کی بنیاد رکھی۔ اس کے قریب ہی آگسٹس کا معبد ہے۔ مسجد کے بیرونی صحن میں جب دروازے سے داخل ہوں تو دائیں ہاتھ ایک حجرہ نظر آئے گا اور عورتوں کی ایک جماعت بھی حجرے کے اندر جاتی یا باہر نکلتی ملے گی۔ یہ حاجی بیرم کی قبر کی زیارت کرنے کے لیے آئی ہیں۔ نمازیوں سے مسجد بھر رہی تھی۔ ابراہیم قیا صاحب مجھے جگہ نہ ملنے کی وجہ سے امام صاحب

کے کمرے میں لے گئے اور ہم نے اس کمرے کے اندر نماز پڑھی۔ مسجد کے بوڑھے امام الحاج ذکائی صاحب ۴۱ سال تک مدینہ منورہ میں رہ چکے ہیں۔ ان کی اولاد اب بھی مدینہ منورہ میں ہے۔ جب میں نے انہیں "فضیلۃ الشیخ" کے لقب سے پکارا تو فوراً کہنے لگے" الفضل عندکم فی باکستان" (فضیلت تمہارے پاکستان میں ہے)۔ انہوں نے بتایا کہ میں اصلاً انقرہ کا باشندہ ہوں۔ عمر کا کثیر حصہ مدینہ منورہ میں گزارنے کے بعد صرف اس لیے انقرہ واپس آ گیا ہوں کہ یہاں دعوت کی اشاعت اور تبلیغ دین کی شدید ضرورت ہے۔ مولانا مودودی مدظلہ العالی کی تمام عربی تصنیفات پڑھ چکے ہیں۔ ان کے بچے مولانا محترم کی ہر نئی کتاب مدینہ منورہ سے بھجواتے رہتے ہیں۔ ترکی ترجموں کی نسبت عربی ترجموں کو رغبت سے پڑھتے ہیں۔

ترک "مرتد" کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے نماز پڑھ کر امام صاحب بھی باہر نکلے اور ہم بھی۔ مسجد کے بیرونی صحن کے اندر جس کے اردگرد وسیع چار دیواری کھینچ رکھی ہے متعدد جنازے رکھے ہوئے تھے۔ ہر جنازے کے ساتھ پھولوں کا ایک گول تختہ کھڑا کیا ہوا تھا اور دیوار سے باہر کثیر تعداد میں لوگ کھڑے تھے۔ چہرے مہرے اور لباس کی وضع سے اونچے گھرانوں کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے قیا صاحب سے دریافت کیا کہ یہ لوگ یہاں کیوں کھڑے رہے، نماز میں کیوں شریک نہیں ہوئے؟ قیا صاحب نے کہا کہ " یہ مرتد لوگ ہیں۔ مسجد میں داخل ہونا پسند نہیں کرتے۔ ان جنازوں کے ہمراہ یہاں آئے ہیں۔ اب انتظار میں ہیں کہ امام صاحب ان کے جنازوں کی نماز پڑھ دیں۔ اور یہ جنازے بخشوا کر اٹھا لیں۔" چنانچہ وہی بات ہوئی۔ مسجد کے اندر سے نکلنے والے نمازیوں نے جنازے کی نماز پڑھی اور یہ لوگ جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہے۔ اور جب نماز پڑھی جا چکی تو یہ اپنا اپنا جنازہ اٹھا کر چلتے بنے۔ چونکہ یہ واقعہ بالکل نرالا تھا۔ میں بار بار ابراہیم قیا صاحب سے پوچھتا رہا کہ جب یہ لوگ خود نماز پڑھنا پسند نہیں کرتے تو اپنے جنازے کو نماز کے بغیر دفن کیوں نہیں کرتے؟ قیا صاحب ان لوگوں کا ذکر کرنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ وہ یہی کہتے رہے کہ یہ مرتد ہیں۔ خود نماز کے قائل نہیں ہیں۔ مگر اپنے مردوں کو نماز کے بغیر دفن بھی نہیں کرتے۔ یہ مسلمانوں کی رواداری ہے کہ وہ ان کی نماز پڑھ دیتے ہیں[1]۔"

---

[1] حال ہی میں ترکی اخبارات میں ایسے ہی ایک جنازے کی ہنگامہ خیز خبر شائع ہوئی ہے۔ استنبول کا روزنامہ

ظہر اور مغرب تک کا درمیانی وقفہ مکتبۂ نور میں گزرا۔ مکتبہ میں کتابیں بھی فروخت ہوتی رہیں اور دعوت و تبلیغ اور افہام و تفہیم کا سلسلہ بھی جاری رہا سعید بدیع الزماں نورسی کے تلامذہ اور معتقدین بکثرت آتے جاتے رہے۔ دو باتیں اُن میں مشترک نظر آئیں۔ ایک یہ کہ موجودہ حکومت پر بعض اصولی اور جزوی تنقیدوں کے باوجود وہ اس حکومت کو "غنیمت" سمجھتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ترکی کے مستقبل کے بارے میں کوئی واضح رائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

اتحاد بابت ۹ مئی ۱۹۶۹ء جنرل عمران اوکتم کے جنازے پر برپا ہونے والے ہنگامے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ طبی امداد کے باوجود جنرل عمران اوکتم جمعرات کو انتقال کر گیا۔ انتقال کے دو روز بعد (یعنی ہفتہ کے روز)، اس کی میت کو مسجد حاجی بیرم خاں میں نماز جنازہ کے لیے لایا گیا۔ وہاں کے امام صاحب نے اوکتم کے مسلمان نہ ہونے پر بحث کرتے ہوئے جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ عام مسلمانوں نے امام صاحب کی تصدیق کی۔ عمران اوکتم کے دوست عصمت انونو صاحب بھی موجود تھے۔ حاضرین ان کے خلاف بھی بھڑک اُٹھے اور اگر ایک فوجی جرنیل جو اس موقع پر موجود تھے محترم عصمت انونو صاحب کا دفاع نہ کرتے اور حملہ آوروں کو پستول نہ دکھاتے تو انونو صاحب کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔ اوکتم کے وارث میت کو وہاں سے اٹھا کر مالتیپے مسجد میں لے گئے۔ وہاں کے امام صاحب نے بھی عوام کی تائید میں نماز پڑھنے سے معذرت کر دی اور کہا کہ مسلم عوام کسی بے دین، منکر خدا اور مرتد کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے۔ وریں اثنا ری پبلکن پارٹی کے لوگ سرکاری اسپتال کے ایک امام صاحب کو لے آئے، لیکن لوگوں کے ہجوم میں وہ بھی غائب ہو گئے۔ بعد ازاں ایک وکیل صاحب الیاسِ نیکلی کے ایک ملازم کو یہ مہم انجام دینے کے لیے پکڑ لائے۔ مگر لوگوں نے نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اور آخر کار عمران اوکتم کو بغیر جنازہ پڑھے دفن کر دیا۔ ترک مسلمانوں نے عمران اوکتم کے بارے میں اس قدر شدید موقف اس وجہ سے اختیار کیا ہے کہ اوکتم نے جو سپریم کورٹ کا چیف جسٹس تھا پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد نئے عدالتی سال کی افتتاحی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اللہ کا تصور انسان کا اپنا گھڑا ہوا ہے۔" اس فقرے پر ترکی کے مسلمانوں نے اسی وقت سخت احتجاج کیا تھا، اور اسی بنا پر مسلمان اسے مرتد سمجھتے تھے۔

قائم نہیں کرتے یا عمداً اُس کا اظہار نہیں کرتے۔ مَیں نے ہر ذمہ دار آدمی سے ترکی کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا مگر وہ آئندہ کے بارے میں قیاس آرائی کے بجائے حال میں محنت، کوشش، جانفشانی اور قربانی پر زور دیتا رہا۔ مکتبہ میں اچھے اچھے لوگ آتے۔ انقرہ کی دونوں یونیورسٹیوں (انقرہ یونیورسٹی اور مڈل ایسٹ یونیورسٹی) کے اساتذہ اور طلبہ بھی اُن میں شامل تھے۔ ہر شخص پر یہ احساس طاری تھا کہ جیسے وہ ہنگامی حالات میں گھرا ہوا ہو اور اپنا رول ادا کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔

نورسی مرحوم کی برسی | سعید اُزدمیر بھی اِزمیر دسمبر سے آگئے۔ تین دن ازمیر میں رہے ہیں۔ سعید نورسی کی برسی کی تقریبات میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ فصیح عربی میں اظہار مافی الضمیر کی قدرت رکھتے ہیں۔ قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ حاصل ہے۔ اپنے دوسرے نوری بھائیوں کی طرح سعید نورسی مرحوم کے رسائل کے اکثر حصے انہیں زبانی یاد ہیں۔ نورسیؒ کی برسی کے بارے میں میرے سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتانے لگے:

"دس ہزار کی تعداد میں ترکی کے مختلف حصوں سے "نور طلبہ" جمع ہوئے۔ اِزمیر کی مساجد میں انہوں نے ڈیرے لگا لیے۔ "سالانہ برسی" کے طفیل سال میں ایک مرتبہ یہ رُوح پرور اجتماع منعقد ہو جاتا ہے۔ مردوں کے علاوہ خواتین بھی شریک ہوتی ہیں۔ خواتین کا انتظام بالکل الگ تھلگ ہوتا ہے۔ تین روز تک اِزمیر قرآن کی تلاوت، مجالسِ ذکر، حلقہ ہائے مذاکرہ اور اسلامی تقاریر سے گونجتا رہا۔ عام اجتماعات بھی ہوتے اور خاص بھی۔ "آپ بیتی" کا جائزہ بھی لیا گیا اور "جگ بیتی" کا تذکرہ بھی ہوا۔ دن کو عام طور پر تقاریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ اسلام کے مختلف گوشے واضح کیے جاتے۔ سعید نورسی مرحوم کی دعوت کا خلاصہ مختلف زاویوں سے پیش کیا جاتا۔ اور راتیں ذکر و فکر اور تعلق باللہ کی استواری میں گزرتی رہیں۔ خواتین کے اندر بڑی شد و مد سے کام ہو رہا ہے۔ شُعلہ یوکسل شنلر نامی ایک خاتون کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شعلہ بیانی سے نواز رکھا ہے۔ بڑی مؤثر اور دلنشیں تقریر کرتی ہیں۔ عورتوں کو اسلامی آداب و حقوق سے آگاہ کرتی ہیں۔ قرآن و حدیث کا بڑے پُرکشش پیرائے میں درس دیتی

ہیں۔ رفقاء کے گھروں میں اُن کی تقریروں اور درسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں نوجوان لڑکیاں اُن کی دعوت و تبلیغ سے اصلاح پذیر ہورہی ہیں[1]۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ قصبات اور دیہات کی ترک عورتیں انقرہ اور استنبول کی تعلیم یافتہ خواتین کو گھروں میں گھسنے نہ دیتی تھیں یہی وجہ ہے کہ ترکی کے دیہات میں مغربی تہذیب اور کمالی اصلاحات کا نام و نشان نہیں ملتا۔ ہمیں بھی شروع شروع میں دیہی عورتوں تک اپنی بات پہنچانے میں بڑی دشواری کا سامنا ہوا۔ مگر "نور طالبات" کی ایک ٹیم نے اِس مہم کو سَر کر لیا۔ دیہی عورتوں کو یہ اطمینان ہو گیا کہ "نورطالبات" اُن جراثیم سے پاک ہیں جو اُن کی روایات کے لیے مُضر ہیں۔ اب قصبوں اور دیہاتوں کی طرف سے اس قدر دعوت نامے آ رہے ہیں کہ "نُورطالبات" کے لیے اُن کو نبھانا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر نُورطالبات کو بھی اللہ تعالیٰ نے بڑی ہمت دے رکھی ہے اور وہ انتھک طریقے سے معرکۂ کارزار میں سرگرمِ عمل ہیں۔

اِزمیر میں سعید بدیع الزمان نورسی مرحوم کا انتقال ہوا۔ چونکہ انتقال کے وقت مرحوم کی نعش کو حکومت نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اس لیے عام لوگوں کو اُن کی قبر معلوم نہیں ہے۔ نورسی مرحوم ہمیشہ یہ دُعا کرتے رہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد انہیں کسی فتنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ انہیں خدشہ تھا کہ عقیدت مند لوگ اُن کی اسلامی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کے بجائے

---

[1] بیروت کے اسلامی جریدہ الشہاب کے یکم جون ۱۹۶۹ء کے شمارے میں "ترکی میں مسلمان عورت کی سرگرمی" کے عنوان سے یہ خبر چھپی ہے کہ شُعلہ نے ترکی کے مغربی علاقے میں متعدد مقامات پر تقریریں کی ہیں۔ ان کی آخری تقریر افیون شہر میں ہوئی۔ شہر کا حال اپنی وسعت کے باوجود لڑکیوں سے پُوری طرح بھر گیا تھا۔ بلکہ شہر کی ۶۰ مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکروں کو تاروں کے ذریعہ ہال کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ اور یُوں شُعلہ کی تقریر سے ہزارہا افراد نے استفادہ کیا۔ موصوفہ نے اپنی تقریر میں اسلامی قانون اور اسلامی پردے پر زور دیا۔ چنانچہ اب اسلامی پردہ کی بحالی کے لیے تُرکی میں بڑی مضبوط تحریک چل رہی ہے اور لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنے سروں کو ڈھانکنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ کمال اتاترک اور ان کے جانشین پردے کے خاتمہ کے لیے بے پناہ کوششیں صرف کرتے رہے ہیں۔

کہیں اُن کی قبر ہی کو اوہام پرستی کا اڈہ نہ بنالیں"۔

نورسی مرحوم کی ایک خاص وصیت | سعید اُزدمیر نے بتایا کہ نورسی مرحوم کا جب انتقال ہوا تو وہ اُس وقت مرحوم کے پاس تھے اور اُن کی آخری وصیتیں محفوظ کر رہے تھے۔ یہ تمام تر وصیتیں اسلامی تحریک کے کام سے متعلق ہیں۔ اُنہی وصیتوں میں سے اُن کی ایک وصیت یہ بھی تھی کہ:

"میرے بعد فکری رہنمائی حاصل کرنے کے لیے تمہیں پاکستان کے اسلامی رہنما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات سے استفادہ کرنا چاہیے۔ میں نے تمہارے ایمان اور عقیدہ کو بچانے کی کوشش میں عمر صرف کی ہے، مولانا مودودی سے تمہیں دین و شریعت کی تفصیلات اور عہدِ حاضر میں اسلامی نظام کے نفاذ کا طریقہ معلوم ہوگا"

سعید اُزدمیر کے علاوہ نوری تحریک کے دیگر ذمہ دار حضرات نے بھی استنبول، انقرہ اور قونیہ میں میرے سامنے اس وصیت کا ذکر کیا ہے۔ نورسی مرحوم کا مطلب یہ تھا کہ دنیا کے اندر اِس وقت اسلامی تحریک جہاں جہاں کام کر رہی ہے اُس کے افراد کو ایک دوسرے کے تجربات اور نتائجِ فکر سے استفادہ کرنا چاہیے۔ اسی وصیت کا اثر ہے کہ طلبائے نور میں مولانا مودودی کی تصنیفات کثرت سے پھیل رہی ہیں اور ان کے دینی شعور میں اضافے کا موجب ہو رہی ہیں۔ (باقی)